محمد حنیف ندوی

ارسطو کی منطق پر ابنِ تیمیہؒ کے اعتراضات

(۲)

علامہ کے ان اعتراضات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کو حدود و تعریفات کی افادیت سے قطعی انکار ہے اور وہ ان کو کسی مرتبے میں بھی مفید یا نافع تصور نہیں کرتے۔ ان کی تنقیدات کا ماحصل یہ ہے کہ جنس و فصل کے ان وضعی طریقوں سے کسی شئے کی ماہیت و ذات پر روشنی نہیں پڑتی اور بالکل ہی کوئی نئی حقیقت جو پہلے سے جانی بوجھی نہ ہو یا جس سے ذہن و فکر کی آشنائی نہ ہو انسانی علم کی زد میں نہیں آپاتی۔ بلکہ ہوتا صرف یہ ہے کہ ایک بات جس کو آپ جانتے ہیں اور کسی نہ کسی درجہ میں جس سے آپ واقفیت رکھتے ہیں تعریف کے ذریعے نسبتہً زیادہ واضح اور معین پیرایہ بیان میں آپ کے سامنے اُبھر کر آجاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ تعریف وحد تمیز و وضاحت تو عطا کرتی ہے۔ مگر کشف حقائق پر اس کو قدرت حاصل نہیں!

لاک کا طنز۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر لاک نے منطق کی رسائیوں پر یہ کہہ کر کامیاب طنز کیا۔ کہ "اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے تو انسان کو صرف دو ٹانگوں پر چلنے والے حیوانات ہی کی صورت میں پیدا کیا تھا اور وہ بھی یہی سمجھتا تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ارسطو کا کہ اس نے آکر پہلی دفعہ انکشاف کیا کہ انسان عاقل اور مدرک کلیات بھی ہے"۔ لاک کا مطلب یہ ہے کہ انسانی ماہیت کے ادراک کو اللہ تعالےٰ نے منطقیوں پر اُٹھا نہیں رکھا تھا کہ جب تک وہ غور و فکر سے انسان کو عاقل قرار نہ دے لیں اس وقت تک اس کو اپنی اس خصوصیت کا احساس ہی نہ ہو پائے۔ بلکہ جس وقت اس نے اس کو دو ٹانگیں بخشی تھیں اور اس قابل بنایا تھا کہ ان کے بل پر وہ دراز کی منزلوں تک پہنچ سکے۔ اسی وقت اس نے اس کو ایک سوچنے والا بھیجا بھی عطا کیا تھا کہ جس کے ذریعہ یہ دور کی کوڑی لاسکے۔ اور اسی وقت اس کے دل میں اپنی معرفت کا خیال بھی ڈال دیا تھا۔

ابنِ سینا کا اعتراف۔ ابنِ سینا نے تعریفِ حد کی ان نارسائیوں کو محسوس کیا ہے۔ چنانچہ اپنی مشہور کتاب "الشفاء" میں انہوں نے کہا ہے کہ کبھی کبھی تعریفات سے سوا تمیز اور ذہنی تنبیہ کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ متعدد مفہوم ایسے ہیں کہ ذہن میں ان کا ایک نقشہ ضرور پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر الفاظ، حروف اور اوصاف وحدود سے ان کی حقیقت بیان کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے۔ مثلاً "موجود" کا ایک مفہوم ہے "شئی" کا ایک تصور ہے۔ اور ضروری

وبدیہی" کا ایک مطلب ہے۔ جسے ہم سب جانتے بوجھتے ہیں۔ لیکن اگر الفاظ و پیرایہ بیان کے تنوعات اور بوقلمونیوں سے ہم ان مفاہیم کو ادا کرنا چاہیں تو وہ خود اس نقشہ سے زیادہ واضح نہیں ہو سکتے کہ جو پہلے سے ذہن میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر "شئ" کی حقیقت پر غور کیجئے۔ منطقیوں نے اس کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ جس کے بارہ میں کچھ کہہ سن سکیں یا جس کا کچھ اتا پتہ بتا سکیں۔ ان کی اپنی اصطلاح میں 'الذی یصح عنہ الخبر' شئ کی صحیح صحیح تعریف ہے۔ مگر دریافت طلب یہ چیز ہے کہ اس تعریف سے حاصل کیا ہوا "الذی" سے کیا مراد ہے؟ یعنی "جس کے بارہ میں" جو آپ فرما رہے ہیں۔ تو آیا خود اس "جس" کی حقیقت بغیر شئ کے تصور کئے ہوئے سمجھ میں آسکتی ہے۔ پھر کہنا سننا یا "اتا پتہ" یا خبر ایسے الفاظ کا مفہوم کیا ایسا مستقل بالذات ہے۔ کہ شئ کو علیحدہ رکھ کر سمجھا جا سکے۔ اسی طرح بتانا یا خبر دینا، خود شئ سے بھی زیادہ عسیر الفہم ہے سوال یہ ہے کہ کیا بتانا؟ اور کس کی خبر دینا؟

اس تعریف کا تجزیہ کیجئے۔ تو صاف معلوم ہوگا کہ آپ نے شئ کی جو تعریف بیان کی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ شئ وہ شئ ہے کہ جس کے بارہ میں ہم کچھ کہہ سن سکیں۔ کیا تعریف الشئ بنفسہ اسی کو نہیں کہتے۔ اور یہ تعریف کا عیب و نقص نہیں؟

تعریفات کی غرض وغات وضاحت و تمیز ہے! غرض علامہ ابن تیمیہؒ کے نزدیک تعریف وحد کے متعلق صرف یہ ادعا غلط ہے کہ یہ کاشفِ حقیقت ہے، یا اس سے کسی شئ کی ماہیت (ESSENCE) پر روشنی پڑتی ہے۔ البتہ اس سے ان کو بھی انکار نہیں کہ فی الجملہ اس سے وضاحت ضرور ہوتی ہے، اور ایک گونہ تمیز قطعی حاصل ہوتا ہے۔ اور اس باب میں یہ حق بجانب بھی ہیں۔ لیکن اس سوءِ ظن کے بعد منطق کا قصرِ رفیع قائم بھی رہ پاتا ہے یا نہیں۔ اور سینکڑوں برس سے علوم و فنون میں اس کا جو درجہ ہے اس کے لئے کوئی وجہ جواز بھی باقی رہتی ہے یا نہیں؟ اس کی ذمہ داری قبول کرنے کی ذمہ واری ان پر عائد نہیں ہوتی۔

منطق لسانیات کی ایک شاخ ہے ان کے نزدیک تو معلوم ہوتا ہے کہ منطق کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ لسانیات کی ایک شاخ ہے۔ جس میں الفاظ و حروف یا قضایا و مقدمات کے اطلاقات سے بحث کی جاتی ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جہاں تک نفس زبان کا تعلق ہے، معانی و فکر کا صحیح صحیح سانچہ کیا ہو سکتا ہے؟ یہی سبب ہے کہ انہوں نے تعریفات و حدود پر خالص لسانیاتی نقطۂ نگاہ سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ نہ تو یہ ضروری ہے کہ ہمیشہ ماہو؟ سے مراد کسی چیز کی حقیقت دریافت کرنا ہی ہو۔ اور نہ یہی ضروری ہے کہ اس کے جواب میں جو کچھ کہا جائے اس میں دائماً ماہیت و جوہر شئ ہی سے تعرض کیا گیا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ماہو سے مقصود سائل کا عموماً یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی شئ کے بارہ میں وضاحت چاہتا ہے اور جواب دینے والا اس سلسلہ میں اس کی رہنمائی کا فرض انجام دیتا ہے۔

وضاحت و تمیز کسی ایک ہی شئی کا نام نہیں پھر ان کے نزدیک اس وضاحت سے متعلق یہ نکتہ خاص قابلِ غور ہے کہ یہ کوئی ایک ہی بندھی ٹکی شئی نہیں۔ بلکہ عرف و وضع اور سائل کے نقطہ نظر کے اختلاف سے یہ مختلف روپ اختیار کرتی رہتی ہے۔ اور اس کے اطلاق کے دائرے بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ پوچھتا ہے کہ خمر کیا ہے؟ تو ہو سکتا ہے کہ وہ شراب کی حقیقت سے واقف ہو، مگر لفظ خمر کے معنی سے ناواقف ہو۔ اور اس کی غرض محض یہ ہو کہ وہ اس لفظ کا کوئی جانا بوجھا مترادف معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اس کو جواب میں بتایا جائے گا کہ خمر عقار کو کہتے ہیں۔ بادہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور رحیق و شراب وغیرہ اس کے معروف نام ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پوچھنے والا فقہی و دینی فطرت کا مالک ہو۔ اور اس کا منشا یہ معلوم کرنا ہو کہ شراب حلال ہے یا حرام ہے۔ اس پر اس کی حرمت واضح کی جائے گی اور حرمت سے متعلق آیات و احادیث پڑھ کر سنائی جائیں گی۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ سائل علم کیمیا سے دلچسپی رکھتا ہو اور دریافت یہ کرنا چاہتا ہو کہ اس کے اجزائے ترکیبیہ کیا کیا ہیں؟ اس صورت میں ظاہر ہے کہ کیمیاء کی اصطلاحوں میں اس سے گفتگو کی جائے گی۔ اور بتایا جائے گا کہ یہ آتش سیال کن کن اجزاء سے ترکیب پاتی ہے۔ غرض ماہو کا جواب دینے سے پہلے یہ دریافت کرنا ہوگا کہ سائل کا عندیہ کیا ہے۔ اور جواب اس عندیہ کے مطابق ہوگا جس میں کہ اختلاف و تنوع کی بہرحال گنجائش ہے۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ اس تمیز و وضاحت تک پہنچنے کا ایک ہی لگا بندھا جنس و فصل کا طریق ہو۔ بلکہ بسا اوقات کسی حقیقت کی منطقی تصویر کشی سے یہ کہیں بہتر ہوتا ہے کہ سائل کے سامنے دریافت طلب چیز سے ملتی جلتی اشیاء کا ذکر کیا جائے۔ اور ان میں جو تشابہ اور تماثل ہے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔ اس طریق سے بغیر وضعی و اصطلاحی تکلفات میں پڑے۔ انسان کسی شئے سے متعلق مطلوبہ علم حاصل کر لینے میں زیادہ آسانی سے کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس کو قطعی اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ فہم و فکر کی قدرتی رفتار اور طریق پر وضع و تکلف کی قدغن عائد کرے۔

یہ ہیں اختصار کے ساتھ وہ اعتراضات جن کا علامہ نے حدود و تعریفات کے سلسلہ میں جا بجا ذکر کیا ہے۔

ایک اہم اعتراض۔ تعریف کا یہ اسلوب فرسودہ نظریہ پر مبنی ہے لیکن ہمارے نزدیک تعریف و حد پر سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ حقائق اشیاء کے بارہ میں وضاحت و تمیز کا یہ اسلوب اس فرسودہ مفروضہ پر مبنی ہے کہ اس عالم کون و مکان کی ہر شئے ساکن ہے۔ اور حقائق اشیاء میں تغیر و ارتقاء کا ہمہ گیر قانون جاری و ساری نہیں۔ حالانکہ موجودہ سطح ذہنی اس مفروضہ کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اور اگر ارتقاء و تغیر کا یہ اٹل قانون صحیح ہے جیسا کہ سب مانتے ہیں، تو پھر کسی شئی کی تعریف کے معنی یہ ہونگے کہ وہ ارتقاء

وتغیر کے صرف ایک مرحلہ اور ایک کڑی کی ترجمانی کرتی ہے تمام مراحل اور تمام کڑیوں کی تشریح و وضاحت نہیں۔ مثال کے لئے مذہب کو لیجئے، اس پر تبدیلیوں کے متعدد دور گذرے ہیں۔ چنانچہ پہلے یہ صرف ایک سادہ قبیلوی طریق حیات سے تعبیر تھا۔ جس کے نظام عقائد و عمل میں کوئی پیچیدگی اور پھیلاؤ نہیں تھا۔ پھر جب مختلف قبائل کا میل جول بڑھا تو اس میں قومیت کا تصور پیدا ہوا، اور عقائد و اعمال ایک خاص سانچے میں ڈھلنے لگے۔ اور جب مختلف قوموں کے فکری دھاروں نے خیالات و افکار کے تنوعات کو گھٹایا، تو اس سے ہمہ گیریت یا آفاقیت کا رنگ پیدا ہوا اور فکر و عقیدہ اور عمل و عادت نے تہذیب و تمدن کی خوشگوار تصویر پیش کی۔

پھر ارتقاء و تغیر کی گاڑی یہاں تک پہنچ کر رک نہیں گئی بلکہ جب مذہب نے قبیلویت کے تنگ دائرے سے نکل کر ہمہ گیریت کے وسیع میدانوں میں قدم رکھا تو اس کے دوسرے پہلو اس سے متاثر ہونا شروع ہوئے اور بیسیوں اختلافی مسائل ایسے ابھر آئے کہ جن سے مذہب میں نئے نئے رجحانات اور افکار نے جنم لیا۔ پھر یہ رجحانات و افکار باہم اس درجہ مختلف ہیں کہ ان سب کو سامنے رکھ کر کوئی ایک ہی جامع و مانع تعریف مذہب کی نہیں کی جا سکتی کہ جو ارتقاء کے اس سارے پھیلاؤ کو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔

مسئلہ اجتہاد

مصنفہ محمد حنیف ندوی

قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلام کا نظریۂ تعلیم

مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین

قیمت ایک روپیہ

عقائد و اعمال

مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی

قیمت بارہ آنے

تہذیب و تمدن اسلامی

مصنفہ رشید اختر ندوی

حصہ اول قیمت آٹھ روپے۔ دوم چھ روپے آٹھ آنے۔ سوم پانچ روپے بارہ آنے

ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲۔ کلب روڈ۔ لاہور